محمد سمعان خلیفہ ندوی*

قرآن کریم کی معجز بیانی:

(سورۂ بنی اسرائیل کے حوالے سے)

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری اور زندہ جاوید کتاب ہے۔ گذشتہ تمام آسمانی کتابیں اپنے اپنے وقت کے لیے محدود تھیں، مگر قرآن کریم کو ابدیت اور عالمگیریت عطا کی گئی۔ قرآن کریم کو یہ مقام عطا کیا گیا کہ اب وہی حق و باطل کی کسوٹی ہے؛ جو چیز اس کے معیار پر کھری اترے گی وہی کھری، باقی سب کھوٹی۔ قرآن کریم کو یہ اعزاز ملا کہ جو اس نے بتایا وہی صحیح اور حق، باقی سب جھوٹ اور باطل۔ قوموں کے عقائد اور ان کی تاریخ کو پرکھنے کا بھی وہی پیمانہ۔ اپنی اپنی کتابوں میں جن تحریفات کا قوموں نے ارتکاب کیا قرآن کریم نے آکر ان کا پردہ چاک کردیا۔ بنی اسرائیل کے متعلق بھی قرآن کا فیصلہ ہے کہ ان کے اختلافات کا حل بھی اسی کے پاس ہے، ان کو ان کی صحیح تاریخ بھی وہی بتائے گا۔

قرآن کریم اور بنی اسرائیل:

قرآن کریم میں عبرت کے لیے جہاں بہت سی قوموں کا تذکرہ ہے وہیں بنی اسرائیل کا بھی تذکرہ اور بار بار تذکرہ کیا گیا ہے، دیگر قوموں کا تو محض اس انداز میں ذکر ہے کہ تاریخ میں اس طرح کی قومیں گزری ہیں جن کے یہ عقائد اور اس طرح کے اعمال تھے، آنے والی قومیں ان کے قصوں سے عبرت لیں اور وہی غلطی نہ کر بیٹھیں جو ان قوموں نے کی تھی کہ پھر اس کے نتیجے میں سنت اللہ اسی طرح جاری ہوگی جس طرح پچھلی قوموں پر جاری ہوئی تھی، ﴿لقد كان في قصصهم عبرة لأولي الألباب﴾ (یقیناً ان کے قصوں میں (اور قرآن کریم کے اس طرز بیان میں بھی جو اس کے لیے اس نے استعمال کیا ہے) عقل والوں کے لیے عبرت کا کافی سامان ہے)۔ مثلاً عاد اور ثمود کا ذکر ہے تو مختصر ہی لفظوں میں۔ لیکن بنی اسرائیل کے تذکرہ میں قرآن کے طرز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے نزول سے پہلے بھی یہ قوم موجود رہی ہے، اور قرآن کے نزول کے وقت بھی روئے زمین پر موجود ہے اور آنے والی صدیوں میں بھی امت اسلامیہ کو ان سے سابقہ پڑے گا۔ قرآن کریم نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے اور صیغے بھی ایسے استعمال کیے ہیں جو ماضی و مستقبل دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان سے متعلق تفصیلات کو ذکر کرنے کے لیے قرآن کریم نے ایک سورت ہی خاص کردی، یہ الگ بات ہے کہ اور

* رفیق علمی دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی، انڈیا

دوسرے مواقع پر بھی اللہ کے ان پر احسانات اور پھر ان کی ناشکری اور دیگر واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے مگر سورۂ اسراء ان کی فتنہ سامانیوں، شرانگیزیوں اور پھر ان پر عذاب کی شکل میں خدائی کوڑے کے برسنے اور ان کے عبرتناک انجام کا خاص طور پر ذکر کرتی ہے۔ قصہ ہی کے زیر سایہ ایک صاحب ایمان کے دل میں پوشیدہ صاف شفاف عقیدہ، والدین کے ساتھ اس کی خوش معاملگی وحسن سلوک، اپنے مال میں اس کے حسنِ تصرف، عقیدہ سے اس کے لگاؤ، اور انبیاء کی بات مان کر ان پر جاں نثاری کے نمونے اس سورت میں دکھائے گئے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر سورت کا پیغام یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے ان میں سے کسی چیز کی پرواہ نہ کی لہٰذا وہ غضب الٰہی کے مستحق بن گئے۔ ویسے بنی اسرائیل کا حال دنیا کی دیگر قوموں سے بالکل مختلف تھا۔ ان پر احسانات الٰہی کی اس قدر بارش کے باوجود کہ انھیں اپنے وقت میں دنیا جہاں کی تمام قوموں پر فضیلت وبرتری عطا کی گئی مگر اس نافرمان وناہنجار قوم نے اللہ کی نشانیوں کے ساتھ تمسخر کیا، پیغمبروں کو ایذائیں پہنچائیں، بعض نبیوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اللہ کے کلام میں تحریف کی جسارت کی، زمین میں اپنی شرانگیزیوں سے تباہی مچائی، اور یہی وہ جرائم ہیں جن کی بدولت اللہ عزوجل کی ان پر پھٹکار پڑی اور ہمیشہ ہمیش کے لیے ان پر ذلت ومسکنت تھوپ دی گئی (ضربت علیهم الذلة والمسكنة)، ان کے نبیوں تک نے انھیں گالیوں سے نوازا، اتنی تحریفات کے باوجود آج تک ان کی کتابوں میں ان کے حق میں نبیوں کی یہ گالیاں موجود ہیں، ان کی انھیں حرکتوں سے امت محمدیہ کو واقف کرانے کے لیے کتاب اللہ کی آیتیں ان کا پول کھول دیتی ہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ﴿انّ هٰذا القرآن يقصّ علىٰ بني اسرائيل أكثر الذي هم فيه يختلفون﴾ (یہی قرآن بنی اسرائیل کو ان کے اکثر اختلافات کا حال سنائے گا)۔

ایک سورت بنی اسرائیل کے نام:

سورہ بنی اسرائیل میں بڑے بڑے واقعات وحوادث کا بیان ہے، بنی اسرائیل کے دومرتبہ فساد فی الارض اور سرزمین قدس میں ہمیشہ کے لیے ان کے خاتمہ کا بیان ہے۔ سورہ کی ابتدا ایسے حیرت انگیز قصہ سے ہے جس کی تفصیلات انسانی عقل کے احاطہ سے باہر ہے، جن کے اندرون میں ایمان جلوہ گر تھا اور جن کے دل ایمان ویقین کی ضوفشانیوں سے منور تھے انہوں نے پہلے مرحلہ ہی میں سرِ تسلیم خم کردیا اس لیے کہ اس سے بڑی عظیم الشان حقیقت کو وہ دل وجان سے قبول کرچکے تھے، البتہ جن لوگوں نے واقعۂ معراج کو اپنی کوتاہ عقلوں کے دربار میں پیش کیا اور اپنے ناقص علم کی میزان میں اس کو پرکھنا چاہا، انہوں نے اس کو محال سمجھا اور اس کا انکار کیا، اس لیے کہ ان کی عقلیں اس طرح کی خبروں کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ اسی لیے سورہ کی ابتدا ایسے لفظ سے کی گئی جو انھیں ایمان کی حقیقت کی طرف لے آئے، جو انھیں خالق اور مخلوق کا فرق سمجھائے، اور ان کے سامنے قدرتِ الٰہی اور انسانی بےبسی اور عاجزی کے درمیان لکیر کھینچ کر رکھ دے: ﴿سبحٰن الذي اسرىٰ بعبده ليلا﴾ (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندۂ خاص کو (اپنی معیت خاصہ کے ساتھ) راتوں رات لے گئی)، اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کو اسراء اور معراج کے سفر پر لے جانے کا بیان ہے، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا اسی کو اسراء کہتے ہیں،

پھر وہاں سے آسمانی سفر کی ابتدا ہوئی جس کا نام معراج ہے۔

مسجد حرام انسانوں کے لیے اللہ رب العزت کی عبادت کا پہلا مرکز اور روئے زمین پر قائم ہونے والی پہلی مسجد ہے۔ مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے، اور مسجد حرام اور مسجد نبوی کے بعد وہ تیسرا حرم مبارک ہے، مگر تعمیر کے اعتبار سے مسجد حرام کے بعد مسجد اقصیٰ وہ دوسری مسجد ہے جو روئے زمین پر قائم کی گئی۔ حضرت ابوذر ﷺ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: یارسول اللہ! روئے زمین پر سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟ فرمایا: ''مسجد حرام''، پھر عرض کیا: اس کے بعد کون سی؟ ارشاد فرمایا: ''مسجد اقصیٰ''، پھر دریافت کیا: دونوں کی تعمیر کے دوران کتنا وقفہ رہا؟ فرمایا: ''چالیس سال، اور جہاں تمھیں نماز مل جائے ادا کرلو، فضیلت مل جائے گی'' (صحیح بخاری)۔ روایتوں کے مطابق بیت اللہ کے معمارِ اول حضرت آدم ﷺ ہیں، مسجد اقصیٰ اس کے چالیس سال بعد بنائی گئی، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ﷺ سے پہلے، حضرت داؤد ﷺ اور حضرت سلیمان ﷺ سے بہت پہلے مسجد اقصیٰ تعمیر کی جا چکی تھی؛ ممکن ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم ﷺ نے بیت اللہ کی دوبارہ بنیاد اٹھائی اسی طرح حضرت سلیمان ﷺ نے دوبارہ مسجد اقصیٰ کی بنیاد اٹھائی ہو۔

معراج کے وقت حضور ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جانے کی حکمت:

آخر کیا بات ہے کہ آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا، جب کہ اس وقت بیت المقدس رومیوں کے قبضہ میں تھا، اور یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ کے دورِ خلافت میں بیت المقدس فتح ہوا، اور حضرت عمر ﷺ نے اس وقت جو معاہدہ اور فرمان جاری کیا قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں آج بھی وہ اہمیت رکھتا ہے۔ بیت المقدس کے رومیوں کے قبضہ میں ہوتے ہوئے معراج کے وقت وہاں لے جانے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی؟ اور آنحضرت ﷺ نے انبیاء کی وہاں پر امامت کی جن میں آدم ﷺ، ابراہیم ﷺ، داؤد ﷺ، سلیمان ﷺ، موسیٰ ﷺ، عیسیٰ ﷺ بھی تھے، اس امامت کا کیا مطلب؟ مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں مسجدوں کا ایک ساتھ ذکر کررہی یہ آیت' سورۂ اسراء کے شروع میں کیوں لائی گئی؟ غور کرنے کے بعد اس کے بڑے دوررس معانی سمجھ میں آتے ہیں۔ مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کا وجود ایک ہے، دونوں کا دین ایک ہے، جو بھی دونوں کے مشترک عقیدہ کی وحدت پر دست درازی کرے گا اس کی خبر لینے کے لیے، شب معراج میں اپنے بندۂ خاص' خاتم الانبیاء کو دونوں جگہ لے جانے والا خدا قیامت تک لوگوں کو کھڑا کرتا رہے گا، اور اس طرح دونوں کے درمیان اتحاد باقی رکھے گا۔

مقدسات کی امانت خاتم الانبیاء کی امت کے حوالے:

اس کا صاف مطلب یہ بھی ہے کہ انبیائی عقیدہ کے اس اشتراک کی وجہ سے اور بنی اسرائیل کی اپنی نافرمانی وسرکشی کی بدولت استحقاق کھودینے کی وجہ سے اب امت محمدیہ ان مقدسات کی امین ووارث ہوگی، اسراء کا یہ سفر اسی حقیقت

کا اعلان تھا کہ سابقہ انبیاء کے مقدسات کی امانت اب خاتم الانبیاء کی امت کے حوالے کی جارہی ہے، ان کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر رکھی جارہی ہے۔

بابرکت سرزمین قدس:

مسجد اقصیٰ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اللہ کی طرف سے وہ بھی بابرکت اور اس کے اطراف بھی بابرکت ہیں۔ اس کے اطراف میں شام کا پورا علاقہ، فلسطین، اردن، سیریا اور لبنان سب شامل ہیں، تاریخ اسلام کے ہر دور میں یہ علاقے شام میں رہے ہیں، یہ جدید جغرافیائی حد بندیاں اسلام دشمن طاقتوں کی سازشیں تھیں جن کے ذریعے اہل اسلام کو کمزور کرنے کی اور ان کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی گئی، ان جغرافیائی حد بندیوں نے مسلمانوں کو خانوں میں بانٹ دیا، اور ایک دھڑ کو متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

قدس کی سرزمین انبیاء کی سرزمین ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن یہیں گزرا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اسحاق علیہ السلام یوسف علیہ السلام، اور بعض اقوال کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبریں بھی یہیں، حرم ثالث مسجد اقصیٰ بھی یہیں، قیامت تک کفر و اسلام کی سرحد والی سرزمین بھی یہی، احادیث کے مطابق حشر و نشر بھی یہیں ہوگا۔ حدیثوں میں صاف آتا ہے کہ قیامت کے قریب آخری وقت میں ملک شام میں قیام اللہ کے راستے میں جہاد و مجاہدہ سمجھا جائے گا۔

قدس: قرآن کی نظر میں:

قرآن کریم میں تین جگہوں پر "الأیمن" کا لفظ آیا ہے (جس کے معنی ہیں: بابرکت)، ﴿ونادیناہ من جانب الطور الأیمن﴾ ﴿قد أنجیناکم من عدوّکم ووٰعدناکم جانب الطور الأیمن﴾ ﴿فلما أتاها نودي من شاطئ الواد الأیمن في البقعة المبارکة﴾، تینوں موقعوں پر ارض فلسطین مراد ہے۔

قرآن کریم نے "مبارک" کا لفظ اکثر موقعوں پر اپنے تعارف کے لیے استعمال کیا ہے، وہیں اس سرزمین کے لیے بھی "البقعة المبارکة" کہنا اس کے تقدس پر مہر ثبت کر دیتا ہے۔ انسانوں میں سب سے معزز شخصیتیں انبیاء کرام کی ہیں، ان عظیم اور معزز شخصیتوں کی پابوسی کا شرف قدس کی سرزمین کو ہزاروں ہزار بار حاصل ہوا ہے۔ "برکة" کے مفہوم میں خیر اور اس خیر میں روز افزوں اضافہ کا مفہوم پوشیدہ ہے اسی لیے خیر و برکت والے پانی (یعنی بارش کے پانی) کے لیے قرآن نے "ماء اً مبارکاً" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور سیاروں میں تہاز مین ہی کیلئے اس لفظ کا انتخاب کیا گیا (وبارک فیها وقدّر فیها أقواتها)، کیوں کہ صرف اسی پر زندگی اور اس میں روز افزوں اضافہ کے سامان حق تعالیٰ کی طرف سے رکھے گئے ہیں۔

سرزمین قدس کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ قرآن کریم نے تقریباً تین بار اس کے لیے "بارکنا فیها"، ایک بار "بارکنا حوله"، ایک بار "بورک"، ایک بار "البقعة المبارکة" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ درختوں میں جس درخت کو قرآن کریم نے "شجرة مبارکة" کہا ہے وہ درخت بھی ارض قدس کی خوش قسمتی ہے کہ خاص اسی کی پیداوار ہے۔ (کأنها کوکبٌ درّیٌّ یوقد من شجرةٍ

مبارکۃ زیتونۃ)۔

اسی طرح قرآن کریم نے اس کو "الأرض المقدسة" کا بھی خطاب دیا، اور جس وادی کو "وادی مقدس" کہا وہ بھی اسی سرزمین پر واقع ہے۔

﴿لتفسدنّ في الأرض مرتين﴾ کا یہود پر انطباق:

سورہ بنی اسرائیل کی ابتدا میں یہود کی سرکشی اور بغاوت کا جس انداز میں ذکر ہے (جس کے بعد ﴿وان عدتم عدنا﴾ کہہ کر بھی خبردار کیا گیا) اس سے ان کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت (وإذتأذّن ربّک لیبعثنّ علیهم إلی یوم القیامة من یسومهم سوء العذاب) بھی تاکید کر رہی ہے کہ یہ ہر زمانے میں سر اٹھاتے رہیں گے، اور اس وقت دنیا ان کی جن فتنہ انگیزیوں اور شرارتوں کا مشاہدہ کر رہی ہے اس سے قرآن کریم کے یہ الفاظ سو فیصد اس پر منطبق ہو رہے ہیں ﴿لتفسدنّ في الأرض مرتين ولتعلنّ علواً كبيراً﴾ (تم زمین میں ضرور بالضرور دو مرتبہ فساد برپا کرو گے اور بہت زیادہ سر اٹھاؤ گے)، اور موجودہ زمانہ میں شاید کچھ زیادہ ہی اس بات کا ان پر انطباق ہو رہا ہے اس لیے کہ اس وقت ان کی ظالمانہ سرکشی بلکہ فرعونیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ نہتے فلسطینیوں پر ان کی طرف سے توڑے جا رہے مظالم 'اسرائیلی بربریت و درندگی' کی ایک خونیں تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔

اسرائیل کی موجودہ سرکشی اور طغیان کو سامنے رکھ کر آیئے جہاں سے گفتگو شروع ہوئی وہیں پہنچتے ہیں اور قرآن کریم کی طرف سے اہل ایمان کو سنائی گئی بشارتوں پر نظر کرتے ہیں: بنی اسرائیل کی دو تاریخی سرکشیوں کا سورہ بنی اسرائیل میں ذکر ہے، پہلی زبردست سرکشی و طغیانی کے بعد ان پر خدائی کوڑا بخت نصر کی صورت میں برس چکا ہے، جس نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، اور یہودیوں کے خون کے دریا بہا دیے تھے، پھر اور موقعے بھی آتے رہے جب جب یہودیوں نے خدا سے بغاوت کی، اور سرکشی و تمرد پر اتر آئے تو خدائی کوڑا ان پر برستا رہا، چاہے ۱۹۶۷ء میں جنرل ٹیٹس کی شکل میں ہو، یا پھر گذشتہ صدی میں ہٹلر کی صورت میں ہو۔

ان کی پہلی تباہی کے بعد ذکر ہے کہ ان میں کسی قدر سدھار پیدا ہوگا، پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی پرانی ڈگر پر واپس آنا شروع کر دیں گے، آزمائش کے لیے انھیں خوب مال و دولت سے بھی نوازا جائے گا، ﴿وامددناکم بأموالٍ وبنین﴾ (اور ہم تمھیں مال و دولت اور بیٹوں سے بھی نوازیں گے)۔ یہودیوں کی موجودہ صورت حال پر غور کرنے والے پر یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ ان کے پاس دولت کی کس قدر ریل پیل ہے، دنیا کے بڑے بڑے بینکوں پر انھیں کا قبضہ ہے، بڑی بڑی کمپنیوں کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ یہودیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی ان کے پاس دولت کی کمی نہیں رہی، ان کی قیادت کے سامنے مالی مسائل کبھی نہیں رہے، آج بھی ان کے لیے یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، حالات سے واقفیت رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ مال اکٹھا کرنے کے لیے چندہ کی مہم پر اسرائیل سے اگر کوئی امریکہ

چلا جاتا ہے تو صرف ایک ہفتہ بھی نہیں گزر پاتا کہ اس کے پاس اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ ''اموال'' کو ''بنین'' پر مقدم رکھنے میں قرآن کی حکمت شاید یہی ہے کہ ''بنین'' (افراد) کی قوت کے مقابلہ میں ''اموال'' کی قوت انھیں زیادہ حاصل رہے گی، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے اور قرآن کی معجز بیانی کا ثبوت ہے کہ ان کے پاس ''بنین'' کی قوت مال کی قوت سے ہمیشہ کم ہی رہی ہے، اسی لیے افرادی قوت کو بڑھانے کے لیے وہ مال کی قوت کا سہارا لیتے رہتے ہیں، اور باہر سے انھیں تعاون حاصل رہتا ہے، چنانچہ موجودہ حالات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح بڑے بڑے ممالک کی سرپرستی انھیں حاصل ہے، اسی لیے ہمیشہ ہمیش کی ذلت ومسکنت کے باوجود وہ عارضی طور پر ''معزز'' معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ ''بحبلٍ من الناس'' کے سایہ میں ہیں، اور فرمایا گیا تھا کہ ''حبلٍ من اللہ'' یا ''حبلٍ من الناس'' کا سایہ ان پر پڑے گا تو ہو سکتا ہے کہ کبھی انھیں (عارضی) ''عزت'' ملے۔

''اموال'' کی قوت کی بدولت ان کی حمایت میں باہر کی فوجیں بھی ہوں گی' یہ بھی قرآن کریم کا اعلان ہے، ملاحظہ ہو؛ کس صفائی کے ساتھ قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿وجعلناکم اکثر نفیراً﴾ (اور ہم نے تمھارے لیے ''نفیر'' (کی طاقت) زیادہ رکھی)۔ ''نفیر'' کہتے ہی ہیں اس فوج کو جو باہر سے مدد کے لیے لائی جائے۔ قرآن کی اس معجز بیانی پر بھی تاریخ نے مہر ثبت کر دی۔

مزاج یہود کی کارستانیاں:

نافرمانی اور تمرد وسرکشی کے نتیجے میں ان کا جو مزاج بنا، اسی نے انھیں دنیا کی ہر تخریبی کارروائی کے پیچھے لا کھڑا کیا، ان کی نام نہاد مذہبی کتاب تلمود نے انھیں تشدد کا خوگر بنایا، فلسفۂ یہودیت (یعنی تلمود کی تعلیمات) کی تطبیق کے لیے سرگرم صہیونیت کی ایک شاخ ''ابناءِ میثاق'' (B'nai Birth) ہی تھی جس نے دنیا کو جنگ عظیم اول کی آگ میں دھکیلا، اور دوسری جنگ عظیم کی آگ بھڑکانے میں بھی اسی کا ہاتھ رہا۔ اس طرح سے ناقابل تلافی نقصانات والی دو عظیم جنگوں کا زخم بیسویں صدی کو دینے کا ''سہرا'' بھی یہودیوں کے سر جاتا ہے۔ یہ سب ﴿ولتعلنّ علوّاً کبیراً﴾ کی تشریحیں نہیں تو اور کیا ہیں؟!۔ ہر جنگ کے پیچھے یہی۔ ہر فتنہ کے پس پشت یہی۔ امن کونسلوں پر بھی انھیں کا قبضہ۔ اقوام متحدہ بھی انھیں کے زیر سایہ۔ عالمی مالیاتی فنڈ کی کنجیاں بھی انھیں کے پاس۔ تعلیم اور نظام تعلیم کے ذریعے سرد جنگ اور ''غزو فکری'' کے پیچھے بھی انھیں کے خفیہ ہاتھ۔ فوجی کارروائیاں بھی انھیں کی کوششوں کا نتیجہ۔

یہود کی دوسری سرکشی عصر حاضر میں ان کا فساد: جب صورت حال یہ ہے تو پھر کیوں بعض مفسرین کے مطابق ان کے فساد کے دونوں موقعوں کو ہم بعثت نبوی سے قبل شمار کر لیں؟ ان مفسرین کی مجبوری یہ تھی کہ ان کی تحقیق بھی یہی تھی، اور ان کے زمانہ تک تاریخی دو بڑے موقعے ہی سامنے آئے تھے۔ مگر قرآن کریم تو ایک زندہ کتاب ہے، اور بنی اسرائیل کا جس انداز میں قرآن کریم نے ذکر کیا ہے اس انداز بیان سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی شرانگیزیاں اور ریشہ دوانیاں بعثت نبوی کے بعد بھی جاری رہیں گی بلکہ کچھ زیادہ ہی، اس لیے کہ یہی ایک امت ایسی ہے جو نزول قرآن سے قبل

بھی روئے زمین پر تھی، اور نزول قرآن کے بعد بھی روئے زمین پر موجود ہے۔ ان کے لیے قرآن کریم کے استعمال کیے ہوئے صیغے بھی یہی بات بتاتے ہیں۔ ﴿یریدون أن یطفؤا نور اللہ بأفواھھم﴾ میں ''یریدون'' کے صیغے کا عموم اور پھر اس کے لیے فعل مضارع کے استعمال میں پوشیدہ بلاغت کا پہلو بھی واضح کر رہا ہے کہ نورِ خدا کو بجھانے کے لیے اعداءِ اسلام کی کوششیں ہر زمانہ میں جاری رہیں گی، اور ظاہر ہے کہ ان دشمنوں میں یہود پیش پیش ہیں۔

دوسری اور آخری سرکشی کے بعد: دوسری سرکشی و بغاوت اور پھر ان کے فیصلہ کن انجام اور آخری تباہی کو بیان کرنے کے لیے لفظ استعمال کیا گیا ہے ﴿فاذا جاء وعد الاخرۃ﴾، عربی زبان اور لغت کی رو سے ﴿الآخرۃ﴾ اس دوسرے موقع کو کہتے ہیں جس کے بعد پھر تیسرا موقع نہ آئے، ''الثانیۃ'' اور ''الآخرۃ'' میں یہی فرق ہے، ''الثانیۃ'' جب بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر اس کا تیسرا چوتھا پانچواں موقع بھی آسکتا ہے، اس کے برعکس ''الآخرۃ'' دوسرے اور آخری موقع ہی کے لیے بولا جائے گا۔ اسی لیے عالم آخرت کو ''الآخرۃ'' کہا گیا کہ دنیا کے بعد اس کا نمبر آئے گا، اور اس کے بعد پھر کوئی عالم نہیں ہوگا۔ ___ جہاں سورہ کے شروع میں ''وعد الآخرۃ'' کہہ کر یہودیوں کے انجام اور آخری تباہی کا ذکر کیا گیا ہے وہیں سورہ کے آخری رکوع میں بھی ﴿وعد الآخرۃ﴾ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ﴿فاذا جاء وعد الآخرۃ جئنا بکم لفیفاً﴾ (پھر جب آخری وعدہ کا وقت آئے گا تو ہم تم سب کو سمیٹ کر لے آئیں گے)۔ اکثر مفسرین اس وعدہ کو آخرت کے ساتھ خاص کر دیتے ہیں، اور ترجمہ کرتے ہیں کہ جب آخرت کا یعنی قیامت کا وعدہ آئے گا.....، لیکن دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ سورہ کے اخیر میں جو ''وعد الآخرۃ'' ہے یہ وہی ''وعد الآخرۃ'' ہے جس کی طرف شروع سورہ میں اشارہ کیا گیا ہے، آخرت میں تو صرف بنی اسرائیل کیا؟ بلکہ سب کو خدا کے حضور حاضر ہونا ہے، رنگ و نسل کے تمام امتیازات ختم کر کے وہاں ہر کسی کو حاضر کیا جائے گا، اور بدعملیوں کے متعلق باز پرس ہوگی۔ مگر جب شروع سورہ اور اخیر سورہ کی دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو اس کا مفہوم یہودیوں سے متعلق ہوگا کہ اس دوسرے اور آخری وعدہ کے موقع پر اے یہودیو! جب تمہاری تباہی کا وقت آئے گا تم سب دنیا بھر سے سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیے جاؤ گے، پھر تمہاری خبر لے لی جائے گی۔

''لفیف'' کہتے ہیں اس جماعت کو جس میں تمام جنسوں اور تمام رنگوں کے لوگ موجود ہوں۔ یہودیوں کی موجودہ صورتحال اور سرزمین قدس میں ان کی آبادی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا بھر کا یہ کوڑا آہستہ آہستہ ایک جگہ جمع کیا جا رہا ہے، رنگوں کے امتیازات مٹائے جا رہے ہیں، ان آباد ہونے والے یہودیوں میں کالا بھی ہے گورا بھی، امیر بھی ہے غریب بھی۔ الغرض سب کو ایک جگہ جمع کر کے اس آخری جنگ کی تیاری ہو رہی ہے جو اہل ایمان اور یہودیوں کے بیچ ہونی ہے، اور اس کے بعد اہل ایمان کو فتح ہوگی، اور قدس کی پاکیزہ و مقدس سرزمین ان نجاستوں سے پاک کر دی جائے گی۔ احادیث کی پیشین گوئی کے مطابق نوامیس فطرت بھی بدلے جائیں گے، قدرت الٰہی کا ظہور ہوگا، درخت درخت کہے گا: یہ میرے پیچھے یہودی کھڑا ہے، آؤ، اس کو کیفر کردار تک پہنچاؤ۔ الصادق المصدوق کی زبان سے نکلی ہوئی ان پیشین گوئیوں کو عالم ظہور میں آنا ہے، کیوں کہ ابھی تک تاریخ

اسلام میں بلاواسطہ یہودیوں سے کوئی جنگ ایسی نہیں ہوئی ہے کہ جس میں براہ راست یہود مدمقابل رہے ہوں اور اہل ایمان کو ان پر شاندار فتح نصیب ہوئی ہو اور یہودیوں کے پرخچے اڑا دیے گئے ہوں کہ اس صورت میں زبان نبوت کی ان بشارتوں کو اس پر منطبق کیا جاسکتا تھا! اس لیے لامحالہ ابھی اس آخری جنگ کا ظہور باقی ہے۔

﴿جئنا بکم لفیفاً﴾ سے قبل اسی آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿وقلنا من بعده لبني اسرائيل اسكنوا الأرض﴾ (اور ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ (اس پوری) زمین کو اپنا مسکن بنالو)، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری جو پوری زمین کو اپنا مسکن بنا چکی ہو، اور روئے زمین پر پھیلی رہی ہو۔ دنیا کے ہر خطہ میں یہ قوم آباد رہی ہے، مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر رہنا خدا کی طرف سے ان پر عذاب تھا (وقطّعناهم في الأرض أمماً)۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہودی جہاں بھی رہتے ہیں اپنا ایک الگ محلہ ضرور بنا لیتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر کسی خطہ میں لاکر چند یہودیوں کو بسا دیا جائے اور وہاں سو سال کے بعد جا کر دیکھا جائے تو ضرور ان کا ایک الگ محلہ نظر آجائے گا۔ دوسری جتنی بھی قومیں ہیں وہ مرور ایام کے بعد ایک دوسرے میں ضم ہوجاتی ہیں مگر یہود ایک ایسی قوم ہے کہ کبھی دوسری قوموں کے ساتھ گھل مل نہیں سکتی، کیوں کہ یہ ان کا مقدر ہی نہیں، قرآن کا صاف اعلان ہے: ﴿وقطّعناهم في الأرض أمماً﴾ (اور (ان کی خرد ماغی کی پاداش میں) ہم نے انھیں ٹکڑوں میں بانٹ کے رکھ دیا)۔ اور اسی قرآن کا کہنا ہے کہ جب ان کی آخری تباہی کا وقت آئے گا تو سب ایک جگہ جمع کردیے جائیں گے۔ یہ خدا کا فیصلہ تھا کہ ان کو ٹکڑوں میں بٹ کر رہنا ہے۔ اور یہ بھی اسی کا فیصلہ ہے کہ سرکشی اور بغاوت کی پاداش میں ان کی اینٹ سے اینٹ بجانے، اور بالآخر ان کے خاتمہ کا جب وقت آئے گا تو رنگ وجنس کے تمام اختلافات کے باوجود ان سب کو ایک جگہ سمیٹ دیا جائے گا، اور پھر ان کی چولیں ہلادی جائیں گی، ان کی شرانگیزیوں کی انھیں خوب سزا دی جائے گی، اور آخرت سے قبل اس دنیا میں ہی انھیں کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے گا، ﴿فاذا جاء وعد الآخرة جئنا بكم لفيفاً﴾ (پھر جب آخری وعدہ کا وقت آئے گا تو ہم تم سب کو سمیٹ کر (ایک جگہ) حاضر کریں گے)۔

قدس کی مبارک سرزمین ان تمام اسلامی فتوحات اور فیصلہ کن معرکوں کی بھی گواہ ہے جن کے بعد اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ کفر وایمان کے مابین تمام تاریخی معرکہ آرائیاں اور فیصلہ کن جنگیں اس بات کی دلیل ہیں کہ آخری فیصلہ کن معرکہ بھی اسی سرزمین پر ہونا ہے، جو حق وباطل کی رزم گاہ رہی ہے۔ قرآن کا بھی یہی کہنا ہے، اور حدیث شریف بھی یہی بتاتی ہے۔ حق وباطل کی آویزش کبھی ختم ہونے والی نہیں! اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان بلاشبہ ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ ہونی ہے! یہودیوں کے مقابلہ پر اہل ایمان اس آیت قرآنی اور بشارت ربانی سے خوش خبری حاصل کریں: ﴿وإذ تأذّن ربّك ليبعثنّ عليهم إلى يوم القيامة من يسومهم سوء العذاب﴾ (اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کردیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے لوگوں کو مسلط رکھے گا جو ان کو بڑی بڑی تکلیفوں میں مبتلا رکھیں گے)۔